ڈاکٹر الیاس عشقی :

کتاب "قاضی عبدالودود: تحقیقی اور تنقیدی جائزے"

مُرتّبہ پروفیسر نذیر احمد کا ایک مطالعہ

کلیم الدّین احمد ، قاضی عبدالودود اور اختر اورینوی بہار کے ایسے اہل قلم ہیں جن کی ادبی حیثیت اردو ادب میں جانی پہچانی اور مانی گئی ہے۔ یہ صاحبان آج اردو ادب میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ کلیم الدین احمد اپنے منفرد جارحانہ اندازِ تنقید اور داستانوں سے متعلق اپنے بنیادی کام اور عام تنقیدی مضامین کی وجہ سے بڑے ادیب مانے جاتے ہیں ، قاضی عبدالودود اپنے تحقیقی کام، تنقیدی معیار اور علم و فضل کی وجہ سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں اور بڑی حد تک اختر اورینوی کو بھی اپنے اِنھیں پیش روؤں کے ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے۔ اور اردو ادب کا قاری ان سے نہ صرف متعارف ہے بلکہ ان کے مرتبے سے واقف ہے۔ تاہم ضرورت ہے کہ ان صاحبان کے کام کا جائزہ لے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے " قاضی عبدالودود : تحقیقی اور تنقیدی جائزے " کے عنوان سے ان پر لکھے ہوئے مشاہیر اہل قلم کے مضامین منتخب کرکے ایک جلد میں جمع کر دیے ہیں۔ کتاب کے آخر میں دو ضمیمے ہیں جن میں سے ایک میں قاضی صاحب کے مضامین کی ایک طویل فہرست جو ۲۹۰ عنوانات پر مشتمل ہے اور جس میں ان کی اشاعت کا مہینہ سال اور رسالے کا نام بھی دے دیا گیا ہے شامل ہے ، دوسرا ضمیمہ وہ یادگاری کتابچہ ہے جو قاضی صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی طرف سے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا گیا تھا اور جس میں آٹھ اکابر اہل قلم کی مختصر تحریریں ہیں جن میں قاضی صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ان کی ادبی حیثیت کا اس سے بڑھ کر اور اعتراف کیا ہوگا کہ جلسۂ تجلیل ان کے شہر میں خاص طور سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس کتاب کی وجہ سے قاضی صاحب سے مُتعلّق بہت سا مواد ایک جلد میں فراہم کر دیا گیا ہے، جو ان پر کام کرنے والوں کو بڑی محنت سے بچائے گا، اور وہ قاضی صاحب کی حیات اور کارناموں کے مختلف پہلوؤں سے بنیادی واقفیت حاصل کر کے قدم آگے بڑھا سکیں گے۔

جہاں تک خیال آتا ہے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کے مضامین کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ اس میں ابھی چند وہ مقالات غالباً شامل نہیں ہیں جو قاضی صاحب نے ۱۸۵۰ء، غالب اور امیر خسرو کے یادگاری سالوں کے سلسلے میں لکھے تھے اسی طرح بعض اور مضامین برصغیر کے رسائل میں بکھرے پڑے ہوں گے۔

قاضی صاحب نے اگرچہ معاشیات اور قانون کی اعلیٰ تعلیم انگلستان میں حاصل کی تھی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ان علوم سے دلچسپی نہ تھی، چناں چہ وہ چند سال انگلستان میں ٹھہر گئے اور انھوں نے وہاں کے مشہور کتاب خانوں میں وقت گذار کر فارسی اور اردو ادب خاص کر تذکروں، شاعروں کے کلیات و دواوین اور تاریخ اور فارسی شعر و ادب کا وسیع مطالعہ کیا اور معلومات کا ایک خزانہ جمع کر کے وطن لوٹے اور یہاں انھوں نے معاشیات اور قانون سے کوئی سروکار نہ رکھا بلکہ اپنے پسندیدہ اردو اور فارسی ادب و تاریخ اور خاص کر تذکروں اور شعراء کے حالات اور کلام کے مطالعے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ ادب کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ ان کا وقت تنہائی میں فکر اور مطالعے میں گذرتا تھا۔ وہ گھر سے بہت کم نکلتے تھے اور ان کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ بھی محدود تھا۔ انھوں نے شاعروں کے حالات اور تذکروں کے بہت سے اہم حالات و سنین کو درست کیا۔ ان کا حافظہ بہت قوی تھا، مطالعے کی وسعت اور غور و فکر نے ان کی تحقیق و تنقید میں ایک خاص وقعت اور وزن پیدا کر دیا تھا جو انھیں دوسرے ناقدین اور محققین سے ممتاز کرتا ہے۔ دوسرے اہل بہار ادباء کی طرح ان کی توجہ کا مرکز بھی بہار تھا، ان کے زیادہ تر مضامین "معاصر" میں شائع ہوتے ہیں جو کلیم الدّین احمد نکالتے تھے۔ بعض ادباء و شعراء کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے انھیں اپنی شخصیت اور کام کی اہمیت کا احساس زیادہ ہوتا ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ کلیم الدّین احمد اور قاضی صاحب تو اس سلسلے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ کلیم الدّین احمد کی تنقید ان کے مزاج ہی کی وجہ سے منفرد ہے اور قاضی صاحب ہر چند کہ اپنے مزاج کی اس کیفیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کی زُود رنجی اور تنک مزاجی کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے اس کا بہترین اظہار اس مضمون میں ہوتا ہے جو ان کے مُتعلّق کلیم الدّین احمد نے لکھا ہے، اور جس میں انھوں نے ان سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ مضمون جس قدر مختصر ہے اس سے قاضی صاحب کے مزاج کی کیفیت اُسی قدر واضح ہوکر سامنے آتی ہے۔ اس مضمون میں سے کہیں کہیں سے کچھ جملے نقل کیے جاتے ہیں جن سے قاضی صاحب کی جیتی

جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس ملاقات میں قاضی صاحب کے ہمرا۔ ان کے دوست پروفیسر حسن عسکری بھی تھے۔ کلیم الدّین احمد لکھتے ہیں :

● "اس بات چیت میں جس میں ان کا بہت کم حصّہ تھا میں نے رسالے (معاصر) کے بارے میں سوالات کیے۔ ان کا جواب سید حسن عسکری صاحب نے دیا، جو ان کے ساتھ آئے تھے۔ رخصت کے وقت ان کی مُہر سکوت ٹوٹی تو بھی ایک آدھ لفظ سے زیادہ ان کی زبان سے نہ نکلا "

● "وہ سیاسی جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے اور جو سیاسی تحریکیں تھیں ان سے دلچسپی تھی۔ دیوان شاد عظیم آبادی انھوں نے اپنے خرچ سے شائع کرایا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت کے بعد شاد نے طوفان اٹھایا۔ کہا کہ میرے کلام کی اشاعت جاری رہی تو میں اعلان کر دوں گا کہ یہ میرا کلام نہیں۔ قاضی صاحب پر یہ الزام لگایا کہ وہ دھوکا دے کر ان کا کلام لے گئے ہیں "

● "گھریلو حالات سے بھی انھیں دلچسپی نہ تھی، بستر تھا اور کتابیں تھیں۔ انسانی زندگی سے گویا قطع تعلّق ہوگیا۔ لوگ ملنے کے لیے آتے تو قاضی صاحب اپنی نئی دریافتوں کا ان سے ذکر کرتے۔ انھیں بولنے کا موقع مل جاتا۔ وہ بولتے بھی بہت اچھا تھے۔ اس لیے لوگ ہمہ تن گوش سا کرتے۔ کتب بینی کے شائق تھے۔ مضامین بھی کبھی کبھی لکھتے برسوں پڑے رہنے قاضی صاحب کو زبردست مُحقّق بنا دیا کچھ لوگ ان سے شاکی رہتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ قاضی صاحب "ہم بگ" کو برداشت نہیں کرسکتے۔ وہ اصول کے پابند ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام ہو اس میں کوئی اصولی جھول نہ ہو۔ وہ سخت گیری کرتے تھے اور ان کی سخت گیری جائز تھی۔ قاضی صاحب چھوٹی چھوٹی باتوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ تحقیق میں کوئی چیز چھوٹی نہیں ہوتی۔ اگر تحقیق کی اہمیت جاتی رہی تو بڑی بڑی باتوں میں بھی کاہلی ہوگی "۔

کلیم الدّین احمد لکھتے ہیں کہ قاضی صاحب اگر وکالت کرتے، سیاست میں کھل کر حصّہ لیتے یا پروفیسری کرتے تو وہ مختلف لوگوں سے ملتے۔ ان کا سامنا ایسے لوگوں سے ہوتا جو ان سے اختلاف رائے رکھتے وہ ان سے تبادلۂ خیال کرتے، ان کے استدلال کو قبول کرتے اور اپنی

منطق سے اپنا موقف ان پر واضح کرتے تو وہ ایک بالکل مختلف شخصیت کے مالک ہوتے۔ دنیا سے کٹ کر تنہا رہنے نے ان کی موجودہ شخصیت کی تعمیر کی تھی۔ اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو ادب میں ان کا وہ مقام نہ ہوتا جو ہے۔ وہ ایک کامیاب پروفیسر یا وکیل ہو کر ممتاز مقام حاصل کرتے۔

کلیم الدین احمد کے نزدیک ان کی تحریروں کا سب سے کامیاب حصّہ وہ مضامین ہیں جو تبصرے کے طور پر وہ وقتاً فوقتاً وہ لکھتے رہے۔ ان تبصروں میں ان کے اصل جوہر کھلتے ہیں۔ مالک آردی ہوں۔ شاد عظیم آبادی ہوں۔ غالب ہوں۔ یا عبدالحق یا خواجہ احمد فاروقی یا پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے مقالے۔ وہ کسی کو نہیں چھوڑتے۔ ان کی معلومات اور ان کا حافظہ اس قسم کی تنقید میں ان کو ایک حقیقی ناقد اور بڑا محقق ثابت کرتے ہیں۔ وہ غلطیوں کی بجا نشاندہی کرتے ہیں۔ قاضی صاحب کو جب تک دلی تشفی نہیں ہوجاتی وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ انھیں محقق کی ذمہ داری کا شدید احساس ہے"۔

انھوں نے دو کتابیں شائع کی ہیں ایک ابن امین اللہ طوفان کا تذکرہ اور دوسری دیوان جوشش۔ اس کا واحد نسخہ انتہائی نامکمل تھا اور ناقص بھی۔ انھوں نے ایک محقق کی طرح ایڈٹ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدیم شاعر کے کلام کو کس طرح پیش کرنا چاہیے۔

وہ اردو کے زبردست حامیوں میں ہیں۔ وہ اپنے نقطۂ نظر میں واضح ہیں۔ جمیل مظہری نے جب گجرال کمیٹی کے سامنے یہ بیان دیا کہ وہ اردو اور ہندی کو دو زبانیں نہیں مانتے ایک زبان مانتے ہیں اس لیے اردو کی علیحدہ کوئی ضرورت نہیں ہے تو قاضی صاحب نے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ جب یہ قضیہ بہار میں زیادہ بڑھا اور واردھا اسکیم کے سلسلے میں سید محمود کو جو بڑے کانگریسی قائد تھے ہندوستانی کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں دقتوں کا سامنا ہوا تو گاندھی نے مداخلت کی اور ہدایات جاری کیں کہ اس قضیے کو خاطر خواہ طریقے پر نپٹایا جائے۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب کے ڈرائنگ روم میں کمیٹی کی نشست ہوئی تھی اس میں قاضی صاحب نے بڑے سلیقے اور مدلل طریقے پر یہ ثابت کر دیا اور منوالیا کہ فرہنگِ آصفیہ میں شامل الفاظ اردو ہیں اور ہندی پرچارنی شبد کوش کے الفاظ ہندی ہیں۔

قاضی صاحب آزاد خیال تھے اوّلاً وہ عربی تعلیم کے حق میں تھے۔ عربی کے خلاف ہوئے تو انگریزی کی طرف رجحان ہوا مگر اس موقف کو بھی ترک کر دیا یہ ان کی آزاد خیالی کی وجہ سے تھا۔

مذہب کے بارے میں ان کی آزاد خیالی ظاہر ہوتی ہے مگر انھوں نے اسے اپنے عقیدے کے طور پر اپنی تحریر میں ظاہر نہیں کیا یعنی عقیدے کو اپنی ذات تک محدود رکھا اس کا اعلان نہیں کیا۔ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے بقول کلیم الدّین احمد وہ بالکل آزاد خیال نہیں اگرچہ انھوں نے اخلاق پر کوئی سیر حاصل کتاب نہیں لکھی مگر ان کی تحریروں میں ان کا اخلاقی نقطۂ نظر چھپائے نہیں چھپتا۔ تاریخ اور مذہب میں ان کی آزاد خیالی بعض اوقات ظاہر ہوجاتی تھی مگر ان کی اخلاق پسندی اس پر پردہ ڈال دیتی تھی۔ کلیم الدّین احمد جیسے سخت نقاد کا ان کے متعلق یہ بیان بہت اہمیت رکھتا ہے کہ:

> قاضی صاحب ایک بہت آزاد شخصیت کے مالک اور بڑے مُحقق تھے۔
> دوسری قابل غور بات کہ قاضی صاحب کی آزاد خیالی نے دوسرے لوگوں کو بھی کسی حد تک متاثر کیا ہے، مگر تحقیق و تنقید کی حد تک۔

قاضی صاحب کے دوست پروفیسر حسن عسکری کے مضامین میں قاضی صاحب کی آزاد خیالی کی دو ایک واضح مثالیں ملتی ہیں۔ حالانکہ ایسے بہت کم مواقع آئے ہیں جب بین الفریقین متنازع فیہ مسائل کا ذکر دوران گفتگو آیا ہو۔ عسکری صاحب بتاتے ہیں کہ ایک دن قاضی صاحب نے تاریخِ اسلام کے ایک اختلافی مسئلے پر شرر کی کتاب کا حوالہ دیا۔ جواباً انھوں نے بھی بہت کچھ کہا۔ قاضی صاحب سنتے رہے مگر اپنے مُنھ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا لیکن ان کا چہرہ ناراضگی کی غمازی کر رہا تھا۔ اس کے بعد عسکری صاحب اٹھ کر چل دیے اور پھر دونوں کے درمیان ایسے مسائل کبھی زیر بحث نہ آئے۔ اس سے دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں ایک یہ کہ ہر معاملے میں وہ اپنی تحقیق کو مدِّنظر رکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ تنک مزاج اور زُود رنج ہونے کے باوجود جسے وہ چھپا نہ سکے تھے، کسی حد تک دوستی اور انسانی تعلقات کا خیال رکھتے تھے مگر مذہب اور تاریخ مذہب کے معاملے میں وہ واقعی اس حد تک آزاد خیال تھے کہ اگر وہ اپنی اس عادت پر قابو نہ پالیتے تو انھیں زندگی میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

پروفیسر حسن عابدی کا مضمون "از دام و دد ملولم و انسانم آرزو ست" ایک تنہا اور خلوت پسند انسان کی ایک ایسی تلاش کی نشاندہی کرتی ہے جسے تحصیل حاصل کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی خلوت پسندی انسان کی نایابی کی وجہ سے تھی یا انسان سے مایوسی ان کی خلوت پسندی کی وجہ تھی۔ عابدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> یورپ میں رہنے کی وجہ سے وہ عام لوگوں سے اس حد تک مختلف تھے کہ

قاضی صاحب انگریزی لباس میں رہتے تھے ۔ کھانا بھی انگریزی طرز کا کھاتے تھے ۔ بلکہ پورا انداز مغربی تھا مگر دیسی کے ساتھ وہ خالص ہندوستانی بلکہ نیشنلسٹ بھی تھے۔ یہی حال مغربی اور انگریزی تعلیم کے سلسلے میں بھی تھا۔ ان کی تحریروں اور انداز زندگی سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اور اسلامی تعلیمات اور ملکی مسائل پر ان کے ذہن میں تضادات تھے۔ جن کو وہ کبھی دور نہ کرسکے ۔ اس لیے بقول کلیم الدّین احمد وہ لوگوں سے بے تکلّف ہونے کے اور تبادلۂ خیالات کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ وہ اپنے خیالات کے خلاف کسی دوسرے کی بات سُننے کے قابل نہ رہے تھے "۔

قاضی صاحب شاعری کو بڑے کھرے اصول پر رکھتے تھے۔ شعر پر ان کی تنقید بہت سخت ہوتی تھی۔ بقول نثار احمد فاروقی قاضی عبدالودود تحقیق کے منظر پر اس وقت آئے جب تحقیق کی راہیں کھل چکی تھیں لیکن اردو ادب کے مطالعے کی روایت ابھی کمزور تھی۔

ڈاکٹر نذیر احمد کا مضمون " متون کی تصحیح و تنقید میں تخریج و تعلیقات کی اہمیت " کو قاضی صاحب کے کام سے اگرچہ براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے لیکن وہ اپنے موضوع پر ایک سیر حاصل اور صاحب مضمون کے انداز کا ایک بے نظیر مضمون ہے جس میں تخریج کی نادر اور بہت سی مثالیں دی گئی ہیں۔ اس مضمون سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور تصحیح و تنقید میں خاص کر تخریج پر کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید مضمون ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے غالب کے کلام نظم و نثر کی طرف اہل تحقیق کو توجہ دلائی ہے اور کہا ہے کہ بعض ناقدین کا یہ خیال درست نہیں کہ اب غالب پر کام کرنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ اگر تخریج ہی کو لے لیا جائے تو غالب پر کام کسی ایک شخص کے بس کا کام نہیں ہے ۔ کئی محققین کے اشتراک ہی سے یہ کام ہوسکتا ہے۔

قاضی صاحب کو لُغت سے بھی خاصی دلچسپی رہی۔ عظیم آباد کے ایک ادارے نے برہان قاطع کا جو ایڈیشن شائع کیا تھا اس پر قاضی صاحب نے بڑی دیدہ ریزی سے کام کیا تھا۔ غالب کے سلسلے میں اس کام کی بڑی اہمیت ہے اس مضمون کو غالب صدی کے سلسلے میں ڈاکٹر نذیر احمد نے جس فاضلانہ تبحّر علمی سے انجام دیا ہے وہ برہان قاطع ہی نہیں بلکہ لُغت کے موضوع پر ایک یادگار کام ہے۔ اسے کسی طرح بھی ایران کے علمائے لُغت ملک الشعراء بہار،

علی اکبر دہخدا اور دکتر محمدؐ معین کے کام سے کمتر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلاشبہ ڈاکٹر نذیر احمد ہمارے دور کے ایک بہت بڑے عالم لُغت ہیں اور تقابل لغات پر ان کا کام آئندہ اس موضوع پر عرصے تک علماء و فضلاء کی رہنمائی کرے گا۔

قاضی عبدالودود تحقیق و تنقید کے میدان میں اپنے پیش روؤں حافظ محمود شیرانی، سیّد سلیمان ندوی، ڈاکٹر محمدؐ اقبال اور ڈاکٹر مولوی محمدؐ شفیع کے بعد آنے والے مُحققین میں اپنا ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ وہ حافظ محمود شیرانی کے کام کی عظمت کے قائل ہیں اور بڑی حد تک انھوں نے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ ایرانی علماء میں قاضی صاحب علّامہ محمدؐ قزوینی اور دکتر محمدؐ معین کے بڑے قائل اور مدّاح ہیں۔ قاضی صاحب کی تعریف میں ان کے ایک دوست علّامہ قزوینی کی ایک تعریفی تحریر لائے تھے جسے وہ بڑے فخر سے لوگوں کو دکھاتے تھے لیکن بعد میں اپنی تحریروں میں علّامہ قزوینی نے اس کے خلاف لکھا بلکہ یہ تک لکھ دیا کہ زبان کی تحقیق میں اہل ہند کا کام قابل اعتبار نہیں ہوتا۔

عرض یہ کہ قاضی عبدالودود اردو ادب کے مُحققین و ناقدین میں ایک بلند مرتبہ نام ہیں جن کو اعتبار کا وہ درجہ حاصل ہوا جو ان کے پیش روؤں کے بعد کم کسی کو نصیب ہوا ہوگا اور اپنے ہم عصروں میں تو وہ اس مقام پر فائز نظر آتے ہیں جہاں ہم عصر اہل قلم نے ان کے کام کے معیاری اور بلند پایہ ہونے کے سلسلے میں واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ اور جو خراج عقیدت ان کو پیش کیا گیا ہے اور جس کی نقل اس کتاب کے آخر میں دی گئی ہے اس میں ان سے مُتعلّق جن معاصرین نے اظہار خیال کیا ہے، اس سے قبل غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے سپاس نامے کے بعد جن لوگوں کی مختصر تحریریں شامل ہیں ان میں مالک رام، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی، پروفیسر محمدؐ حسن، جناب گوپال متّل، رشید حسن خاں، گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریریں شامل ہیں جو انھوں نے قاضی صاحب کے سلسلے کے جلسۂ تجلیل میں پڑھی تھیں اور ایک یادگار کتابچے میں شائع ہوئی تھیں۔